بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قومیت اور جمہوریت کے نتائج سے آپ پچھلی صحبت میں روشناس ہو چکے ہیں۔ اب میں اس ناپاک تثلیث کے اقنومِ ثالث، یعنی حکومت کے پارٹی سسٹم سے آپ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں یہ اُس جال کا آخری بند ہے جس میں پھنس جانے کے بعد میدزبوں کے لیے نقدِ جان ہار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حکومت کے پارٹی سسٹم سے مراد یہ ہے کہ انتخابات میں جو جماعت غالب اکثریت حاصل کرے اس کا سردار حکومت کا ناظمِ اعلیٰ، یعنی وزیرِ اعظم ہو، اور وہ صرف ان لوگوں کو وزارت میں شریک کرے جو اس پارٹی کے اصول اور نظام کی اطاعت قبول کر چکے ہوں ۔ اس طریقہ کی بنیاد اور اسکی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱۔ انتخابات میں پارٹی صرف ان لوگوں کو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کرتی ہے جنہیں وہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے موزوں ترین سمجھتی ہو۔

۲۔ رائے عام کو پارٹی کا ہم خیال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ جو امیدوار کامیاب

ہو وہ اپنے شخصی اثر سے نہیں بلکہ پارٹی کے اثر اور اس کے اعتماد پر کامیاب ہو۔ بالفاظ دیگر کسی حلقۂ انتخاب میں کسی امیدوار کا جیت جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس حلقے کو پارٹی نے مسخر کر لیا۔

۳۔ اس طریقہ سے جب کسی پارٹی کو مجلس قانون ساز میں اکثریت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اپنی کامیابی کو اس بات کی دلیل قرار دیتی ہے کہ قوم کی اکثریت اس پر اعتماد رکھتی ہے، لہذا اسے اپنی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلانے کا حق حاصل ہے۔

۴۔ مجلس قانون ساز میں پارٹی کے ہر رکن کو جماعتی نظام کی پوری پابندی کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی رائے اور عمل میں کسی قسم کی آزادی نہیں برت سکتا۔ وہ نہ کسی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون کی مخالفت کر سکتا ہے جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، نہ حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کر سکتا ہے، نہ خود اپنی طرف سے کوئی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون پیش کر سکتا ہے جسے پارٹی کی منظوری حاصل نہ ہو، اور نہ اس وقت تک پارٹی کے طریق کار میں کوئی ترمیم کرا سکتا ہے جب تک وہ پارٹی میں غالب اثر پیدا نہ کر لے۔ اگر پارٹی میں رہ کر وہ کسی قسم کی آزادی رائے استعمال کریگا تو اسے پارٹی سے خارج کر دیا جائیگا، اور دوسرے انتخاب میں وہ کسی ایسے حلقہ سے کامیاب بھی نہ ہو سکیگا جو پارٹی کے زیر اثر ہو۔

۵۔ جو شخص پارٹی کے اصول و مقاصد کا سب سے بڑا وکیل ہو، اور جس کو پارٹی کی عظیم اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، وہی اس کا لیڈر ہوتا ہے، اور اسی کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے کہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلائے۔

۶۔ وزارت کی ترتیب میں پارٹی کا لیڈر صرف ان لوگوں کو لیتا ہے جو نہ صرف جماعتی نظام کے پابند ہوں بلکہ جماعت کی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلانے میں سب سے زیادہ مفید و کارآمد ہوں۔ پارٹی گورنمنٹ میں کسی وزیر کے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ جماعتی پالیسی سے انحراف کر سکے

یا کسی ایسے مفاد کی حفاظت کا نام بھی لے سکے جو جماعتی مفاد کے خلاف ہو۔

اس طرح حکومت کا پورا اقتدار ایک جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ وہی جماعت اپنے حسب منشا قوانین بناتی ہے، اسی کے وزراء ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں، اور اسی کی پالیسی کے مطابق حکومت کی مشین کے تمام کل پرزے حرکت کرتے ہیں۔ یہ جماعت جب تک اکثریت میں رہے، اسے اپنے کسی کام میں قلیل التعداد جماعتوں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ مدد لینا تو درکنار وہ انکی رائے کی پروا کرنے پر بھی مجبور نہیں ہوتی۔

اس طرز حکومت کی بنا، دراصل قومیت اور جمہوریت کے اصولوں پر ہے جس ملک میں ایک قوم رہتی ہو، اور جہاں جمہوریت کی بنیاد مستحکم ہو چکی ہو، صرف اسی ملک میں ایسا طرز حکومت جائز طور پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں اس طرز حکومت کو اس لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے کہ درحقیقت یہاں ایک قوم رہتی ہے اور جمہوریت کی بنیاد موجود ہے۔ بلکہ یہاں اسکو اسلیے اختیار کیا گیا ہے کہ ایک جماعت اس کے ذریعہ سے حکومت کا کلی اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے تاکہ حاکمانہ اقتدار سے کام لیکر ہندوستان کی مختلف قوموں کی قومیتیں مٹا سکے اور ان کو ایک ایسی قومیت میں مدغم ہو جانے پر مجبور کردے جسکی وضع و ہیئت اور جسکی تہذیبی و تمدنی صورت متعین کرنے کا اختیار تمام تر اُسی برسرِ اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہو۔

دن کی روشنی میں جو چیز امر واقعی کی حیثیت سے موجود ہو، اس سے کوئی آنکھوں والا انکار نہیں کرسکتا۔ واقعات تو یہ ہیں کہ:

۱- کانگریس پارٹی ہندوستان میں جہاں کہیں کامیاب ہوئی صرف ہندوؤں کے ووٹوں سے کامیاب ہوئی۔ مسلمانوں میں اس کو بحیثیت مجموعی پانچ فی صدی سے زیادہ ووٹ نہیں ملے۔ اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ اسکو ملک کی آبادی کے صرف ایک حصہ کا اعتماد حاصل ہے، اور چند صوبوں کی مجلس قانون ساز میں اسکی اکثریت محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان صوبوں میں وہ قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے جسے اس پارٹی پر اعتماد ہے۔

۲- اسکے ارکان تمام تر ہندو ہیں اور "مسلمان" اس میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳- اس میں کسی غیر ہندو کو لیڈر کی حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ باوجودیکہ ایسے متعدد غیر ہندو اس پارٹی میں موجود ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو "ہندی قومیت" میں پوری طرح جذب کردیا ہے، جو اپنی قوم سے قریب قریب کٹ چکے ہیں، اور جنکی خدمات بھی کسی ہندو کانگریسی سے کم نہیں ہیں، مگر ابھی تک چونکہ انہوں نے اپنے نام نہیں بدلے ہیں، اور ابھی تک غیر ہندو قومیت سے تعلق رکھنے کی بُو اُنکے ناموں سے آرہی ہے اسلیے ان میں سے کسی کو ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں پارٹی لیڈر بننے کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ مسٹر نریمان اور ڈاکٹر محمود کی مثالیں اسکی نمایاں ترین مثالیں ہیں۔ اگر ایک کا نام مسٹر کھیر اور دوسرے کا مسٹر سنہا ہوتا تو یقیناً یہی اپنے اپنے صوبوں میں پارٹی لیڈر ہوتے۔

۴- اس پارٹی کی ذہنیت اور اسکے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے نظام میں اگر کسی غیر ہندو کو اثر و اقتدار کی کوئی جگہ دیگی بھی تو صرف اُس وقت جبکہ اسے اس امر کا پورا اطمینان حاصل ہوجائے کہ وہ پارٹی کے مفاد کی خدمت، ایک ہندو کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقہ سے کرسکے گا، مثلاً غیر ہندو قوموں کو فریب دینا، یا تعلیم اور تہذیب و تمدن کے مسائل میں پارٹی کی پالیسی کو غیر ہندو قوموں پر نافذ کرنا۔ اس باب میں کانگریس پارٹی کا وہی حال ہے جو انگریزی حکومت کا حال ہے کہ وہ کسی ہندوستانی کو بڑے ذمہ دارانہ عہدے صرف اسی حالت میں دیتی ہے جب اسے یہ توقع ہو کہ وہ انگریزی

امپیریلزم کی خدمت انگریز کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح انجام دیگا۔ اگر وہ کسی ہندوستانی کو گورنر یا وائسرائے بنائے تو یہ اس بات کا ثبوت نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کے حق میں اسکی پالیسی بدل گئی ہے، بلکہ دراصل یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ہندوستانیوں میں اسکو اتنا بڑا غدار مل گیا ہے جسکی غداری پر انگریز کی وفاداری سے بھی زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

مگر ان صریح حقائق کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ:

۱۔ کانگریس پارٹی، ہندو پارٹی نہیں ہے بلکہ "قومی پارٹی" ہے، یعنی اُس "قوم" کی پارٹی ہے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری قوموں سے مل کر بنتی ہے۔

۲۔ اس پارٹی کا اکثریت میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسکو "قوم" کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے۔

۳۔ اس دلیل سے وہ انگلستان کی طرح ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنے میں حق بجانب ہے۔

۴۔ اس پارٹی کی موجودگی میں ہندوستان کی کسی قوم کو مجالس قانون ساز میں اپنی الگ پارٹی بنانیکا حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسکے نمائندوں کو کانگریس کے عہدنامے پر دستخط کرکے کانگریس پارٹی کے نظام کا ایک جزء بن جانا چاہیے۔

۵۔ اگر غیر ہندو قومیں اپنی الگ پارٹیاں رکھنے پر اصرار کرینگی تو کانگریس پارٹی انکے ساتھ مخلوط وزارت نہیں بنائیگی، بلکہ صرف اپنی پارٹی کی وزارت بنائیگی اور اس وزارت میں صرف اُن غیر ہندو اشخاص کو لیا جائیگا جو پارٹی کے نظام میں جکڑے ہوئے ہوں یا وزارت کے لالچ میں اپنے آپکو خود جکڑوالیں۔ دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ قلیل التعداد اقوام میں سے کسی قوم کو بحیثیت ایک قوم کے حکومت میں حصہ دار نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ اسکے افراد کو صرف انفرادی حیثیت سے

حکومت کا خادم بنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ پارٹی کی اطاعت کا حلف لیں، ورنہ "قومی" وزارت بغیر اسکے بھی بن سکتی ہے کہ کوئی غیر ہندو اس میں شریک ہو۔

یہ انگریزی راج کی حمایت وحفاظت میں ہندو راج قائم کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ جیسا کہ میں اوپر ظاہر کرچکا ہوں، موجودہ حالات میں اس امر کی توکبھی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی غیر ہندو، پارٹی لیڈر بن سکے گا، اور پارٹی میں غیر ہندو ارکان کو اتنا اثر حاصل ہوسکیگا کہ جماعتی نظام اور اسکی پالیسی کو وہ کم ازکم اپنے قومی مفاد کے خلاف نہ بننے دیں۔ ایسی حالت میں اگر پارٹی سسٹم کی حکومت کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کے دو پہلو ہونگے، اور دونوں یکساں مضر ہونگے:

۱۔ اگر مسلمان اپنی علحدہ پارٹیوں کو توڑ کر نام نہاد "قومی پارٹی" میں ضم ہوجائیں تو انکی اپنی جماعتی حیثیت ختم ہوجاتی ہے کیونکہ وہ پارٹی کے ڈسپلن میں جکڑ دیے جائینگے، اور ڈسپلن کے خلاف کوئی آواز بلند کرنا، یا کوئی تجویز اور مسودۂ قانون اپنے قومی مفاد کے لیے بطور خود پیش کرنا، یا پارٹی کی کسی ایسی تجویز اور مسودۂ قانون کی مخالفت کرنا، جو انکے قومی مفاد کے خلاف ہو، ان کے لیے ناممکن ہوگا وزارت میں بھی کسی مسلمان کی شرکت مسلمانوں کی اجتماعی تائید ورضا پر نہیں بلکہ پارٹی کے ہندو لیڈر اور پارٹی کی ہندو اکثریت کے معیار انتخاب پر مبنی ہوگی، اور غیر ہندو کے لیے ان کا معیار انتخاب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یا تو وہ ہندی قومیت میں جذب ہوچکا ہو، یا پھر ایک وفادار خادم کی حیثیت سے کام کرسکے، چاہے اپنے گھر پر تفسیر قرآن ہی کیوں نہ لکھتا ہو۔ اس طرح قانون سازی اور تنفیذ قانون، اور سرکاری پالیسی کی تشکیل سے مسلمان اور تمام غیر ہندو عملاً بے دخل ہوجاتے ہیں۔

۲۔ اگر مسلمان اپنی علحدہ پارٹیاں قائم رکھیں تب بھی نہ تو حکومت کے اثر واقتدار میں انہیں کوئی حصہ مل سکتا ہے، اور نہ قانون سازی میں وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے کوئی مؤثر طاقت استعمال کرسکتے ہیں

لیکن یہ دونوں پہلو بھی صرف اس وقت تک نمایاں ہو رہے ہیں جب تک انتخاب، جداگانہ ہے اور اس میں مسلمانوں کو اپنی قومی خواہش اور رائے کے اظہار کا موقع مل رہا ہے۔ جب یہ چیز باقی نہ رہیگی تو کسی کے لیے یہ کہنے کا موقع بھی باقی نہ رہ سکیگا کہ فلاں کام محض اکثریت کے زور پر مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کیا گیا، بلکہ اس وقت تو خود مسلمانوں ہی کے نام سے وہ سب کچھ ہوگا جو "قوم پرست" کرنا چاہتے ہیں۔ اسی غرض کیلیے وہ کوشش کر رہے ہیں کہ جداگانہ انتخاب کو مخلوط انتخاب سے بدل دیا جائے، اور جب تک جداگانہ انتخاب باقی ہے، اسکے اثر کو باطل کرنیکے لیے انہوں نے مسلم ماس کانٹیکٹ کی تحریک شروع کر دی ہے، تاکہ وہ اپنی پسند کے "قوم پرست مسلمانوں" کو عامۂ مسلمین کے ووٹوں سے منتخب کرا سکیں۔

یہاں پہنچ کر آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس جدوجہد کو تمام ہندوستان کیلیے جنگِ آزادی قرار دیا جا رہا ہے اسکی تمام اخلاقی و مادّی طاقتیں کس طرح محض ایک قوم کی آزادی اور باقی تمام قوموں کی غلامی — پہلے سے بدتر غلامی — کیلیے استعمال کی جا رہی ہیں۔ قومیت، جمہوریت، اور پارٹی سسٹم کے اصول صرف اسلیے اختیار کیے گئے ہیں کہ وہ ہندو قوم کو ہندوستان کی حکمراں قوم بنانے کے لیے سب سے زیادہ مفید ہیں۔ اگر ان اصولوں کو تسلیم کر کے ہم جنگ آزادی میں شریک ہوں تو اسکے معنی دراصل یہ ہونگے کہ ہم انگریز کی غلامی کو ہندو کی غلامی سے بدلنے کے لیے جنگ کریں!

فریب تو دیکھیے، پہلے ہندوستان کو ایک قوم فرض کیا جاتا ہے، تاکہ اس مفروضہ پر جمہوریت، اور جمہوریت پر پارٹی سسٹم کی حکومت قائم کی جا سکے۔ پھر جب جمہوریت اور پارٹی سسٹم کے ذریعہ سے حکومت کا اقتدار سمٹ کر ایک جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے، تو اسکو ہوشیاری کے ساتھ تعلیم کی نئی تجاویز، زبان و رسم الخط کی تدریجی ترمیم، قوانین معاشرت کی شکست و ریخت،

اور معاشی وسائل پر قابو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تاکہ ان طاقتوں سے کام لیکر ایک "قوم" بنائی جاسکے۔ یہ ایک منحوس چکر (Vicious Circle) ہے جو فریب سے شروع ہوکر ظلم پر ختم ہوتا ہے اور پھر ظلم سے شروع ہوکر فریب پر جا پہنچتا ہے۔ اس چکر میں ہندوستان کی قلیل التعداد قوموں کو پھانسنے کا نام "جنگ آزادی" رکھا گیا ہے!

اب سے دس سال پہلے جب نہرو رپورٹ مرتب ہوئی تھی، اسی وقت معلوم ہوچکا تھا کہ "آزادی" کے اِن علمبرداروں کی اصلی نیت کیا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی تھی وہ اُسی وقت سمجھ چکے تھے کہ انگریزی سنگینوں کی حفاظت میں ہندو راج قائم کرنے کا نام "سوراج" رکھا گیا ہے، اور ان لوگوں کی تمام جدوجہد اسی قسم کے سوراج کے لیے ہے۔ یہی نقشہ جس پر آج ہندوستان کے نظام سیاست کی تعمیر ہورہی ہے، نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا تھا۔ یہی قومیت کا مفروضہ تھا۔ یہی جمہوریت کے اصول تھے۔ اور اسی طرح حکومت کے پورے اقتدار کو ایک جماعت میں مرکوز کردینے کی تجویز تھی۔

جب مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے بالاتفاق اسکو رد کردیا تو لاہور کانگریس میں اس رپورٹ کو غرقِ روای کرکے "آزادی" کا علم بلند کردیا گیا۔ جاننے والوں نے پھر کہا کہ یہ محض ایک فریب ہے۔ ان لوگوں کا اصل مقصد وہی ہے جسکا اظہار یہ اپنے مجوزہ دستور اساسی میں کرچکے ہیں، اور اب یہ آزادی کا علم محض دھوکا دینے کیلیے بلند کیا جارہا ہے۔ مگر مسلمانوں کے دو طبقے جو سب سے زیادہ کمزور تھے اس آزادی کے نزلہ سے ماؤف ہوگئے۔۔۔ ایک وہ طبقہ جو مغربی تعلیم و تہذیب کے اثر سے اسلامی قومیت کے احساس کو کھوچکا ہے اور ہر چیز کو اپنی معاشی فلاح کے عوض بیچنے پر تیار ہے۔ دوسرا ان علماء کا طبقہ جو زمانۂ جدید کی سیاسی چالوں کو سمجھنے سے طبعاً معذور ہیں۔۔۔ ان دونوں طبقوں پر آزادی کے جھنڈے

کا وہی اثر ہوا جو جنگ صفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج پر لشکر معاویہؓ کے نیزوں سے قرآن لٹکتے دیکھ کر ہوا تھا۔ اُس وقت بھی مسلمانوں کی قومی کمزوری کا صحیح اندازہ لگا کر ناجائز فائدہ اٹھایا گیا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی نے اسلامی تاریخ کا رُخ ہمیشہ کیلیے بدل دیا، اور اب بھی جو غلطی ہوئی اور ہو رہی ہے وہ کم از کم ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا رُخ پہلے سے بھی زیادہ افسوسناک نتائج کی طرف پھیرتی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ آزادی کے جھنڈے کو دیکھ کر دیوانہ وار اس کی طرف لپک گئے، اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اور غیر سب پر اپنی قوم کی اس کمزوری کا راز فاش کر دیا کہ کتنی آسانی کے ساتھ اس قوم میں پھوٹ ڈالی جاسکتی ہے، اور کتنی آسانی کے ساتھ ہر فریب کار دشمن کو اس قوم میں سے اپنے مطلب کے ہزاروں آدمی مل سکتے ہیں۔

ان دو گروہوں کی نادانی سے اتنا بڑا نقصان ہم کو پہنچ چکا ہے جسکی تلافی اب بمشکل ہو سکتی ہے، اور اس سے زیادہ بڑا نقصان اب پہنچنے والا ہے جسکی تلافی شائد بمشکل بھی نہ ہو سکے گی۔ مختصر الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مسلمان سخت پراگندگی و انتشار میں مبتلا ہو گئے، آنے والے خطرات کے مقابلہ میں انکو منظم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی جاسکی اور انکی قومی زندگی کے ایسے پندرہ سال خام کاریوں میں ضائع ہو گئے جن کا ایک ایک لمحہ فیصلہ کن تھا۔ دوسری طرف ہمسایہ قوم اپنی منظم جدوجہد اور خود مسلمانوں کی امداد و اعانت سے انگریزی سلطنت کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ نہرو رپورٹ میں جس نصب العین کا انہوں نے اظہار کیا تھا، دس سال کے بعد ظاہر ہو گیا کہ آج بھی وہی نصب العین انکے سامنے ہے، بلکہ اس نصب العین کی پہلی منزل پر وہ پہنچ بھی گئے اور اب آخری منزل ان سے بہت قریب ہے۔ دستور جدید کی رو سے صوبوں میں جو حکومت خود اختیاری عطا کی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ٹھیک اسی نقشہ پر مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر شروع

کردی ہے جو دس سال پہلے وہ بنا چکے تھے، اور اب اُن کا قدم اپنی آخری منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے، یعنی یہ کہ مرکزی حکومت پر بھی ان کو اقتدار حاصل ہو جائے، تاکہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انکی حکومتوں کو بھی مرکزی اقتدار کے واسطے سے قابو میں لاکر "سوراج" کے نصب العین ـــــ ہندو راج زیر سایۂ سلطنت برطانیہ ـــــ کی تکمیل کر دی جائے۔

مگر یہ نتیجہ سامنے آجانے کے بعد بھی ہمارے آزادی کے دیوانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ فرعون کے گھر میں بچۂ فرعون نشوونما پا رہا ہے اور عنقریب ولی عہدی کی رسم ادا ہونیوالی ہے۔ مگر یہ سادہ لوح اب بھی ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو یقین دلاتے پھر رہے ہیں کہ فرعون کے ہاں موسیٰ پرورش پا رہا ہے۔ وہاں آپکی قومیت کو ختم کر دینے کے لیے ذبحِ اطفال سے زیادہ خطرناک اور زیادہ کارگر پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو چکا، اور حضرت فرما رہے ہیں کہ فی الحال تو آزادی کی جنگ ـــــ یعنی اپنی قبر آپ کھودنے ـــــ میں آنکھیں بند کر کے شریک ہو جاؤ، پھر آزادی حاصل ہو جانیکے بعد ـــــ یعنی قبر میں مدفون ہو جانیکے بعد ـــــ اُٹھ کر اپنی قومی زندگی (حیات بعد الموت!) کی حفاظت کر لینا۔

کہا جاتا ہے کہ قومیت کے مفروضے، اور جمہوریت کے اصولوں، اور پارٹی سسٹم پر جو نظام حکومت بن رہا ہے، اُس میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلیے کراچی کے بنیادی حقوق بالکل کافی ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کا مأخذ ۱۶۸۹ء کا اعلانِ حقوق اہل انگلستان ہے۔ اس کے بعد اسی قسم کے اعلاناتِ حقوق مختلف مغربی اور خصوصاً امریکی دستوروں میں شامل کیے جا چکے ہیں۔ مگر اس قسم کے اعلانات کبھی کسی ایسی جماعت کے حقوق کا تحفظ نہ کر سکے جسے تہذیب، یا مذہب، یا نسل و رنگ نے اپنے ہم وطنوں کی اکثریت سے جدا کر رکھا ہو۔ انگلستان میں اس اعلان کے باوجود ڈیڑھ سو

برس تک کیتھولک فرقہ پر سخت مظالم ہوتے رہے۔ ۱۷۷۸ء میں ان کی اصلاح حال کیلیے ایک تجویز پیش ہوئی مگر نصف صدی تک کوئی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۲۸ء تک انکے حق میں ۱۴ بل پیش ہوئے، اور ہر بار پارلیمنٹ نے ان کو رد کر دیا۔ آخر کار ۱۸۲۹ء میں ان کو پارلیمنٹ کی رکنیت اور سیاسی و نظمی ادارات کی شرکت کا حق ملا، مگر اس وقت جبکہ انکی جد و جہد خطرناک حدود تک پہنچ چکی تھی۔

ممالک متحدۂ امریکہ کے دستور اساسی میں بھی باشندگانِ ملک کے بنیادی حقوق کا صریح اعلان کیا گیا تھا، مگر قریب قریب ۷۵ سال تک امریکہ کے لاکھوں حبشی باشندے نہ صرف اِن حقوق سے بلکہ عام انسانی حقوق سے بھی محروم رہے۔ ۱۸۶۱ء - ۱۸۶۵ء کی خانہ جنگی کے بعد ان کو کسی حد تک انسانی حقوق حاصل ہو گئے، لیکن حقوق شہریت سے اب بھی وہ اسی طرح بے بہرہ ہیں، بلکہ آج اس بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بھی ان کو زندہ جلا دینے اور جانوروں کی طرح ان کا شکار کرنے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، درانحالیکہ امریکہ کی مہذب سلطنت میں پولیس اور عدالت کا ایک مکمل نظام موجود ہے۔

یورپ کی ۲۵ ریاستوں میں ساڑھے تین کرور باشندے اسوقت اقلیتوں کی حیثیت سے رہتے ہیں اور قریب قریب ان تمام اقلیتوں کے بنیادی حقوق، مقدس تحریروں کی صورت میں لکھے ہوئے موجود ہیں، مگر اسکے باوجود اکثریت کی حکومت ہر جگہ ان پر اپنی زبان اور اپنے نظام تعلیم کو مسلط کر رہی ہے، اور ہر قسم کی تمدنی، معاشی اور سیاسی تکلیفیں ان پر ڈال رہی ہے تاکہ یا تو وہ اکثریت کی قومیت میں جذب ہو جائیں یا صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیں۔

۱۹۱۹ء کے وائمار کانسٹی ٹیوشن (Weimar Constitution) کی رو سے جرمنی میں بھی تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق محفوظ کیے جا چکے ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ ان کیلیے جرمنی کے حدود میں عزت کے ساتھ روٹی کمانا قریب

قریب محال ہوگیا ہے، اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے انکے لیے بند ہیں۔ کوئی آزاد پیشہ بھی وہ آسانی کیساتھ نہیں کرسکتے۔ عدالتوں میں انکے ساتھ صریح نسلی امتیاز برتا جاتا ہے، اور انصاف کا نظریہ، یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم ثابت نہ کردے۔ عام باشندے اگر ان کے ساتھ کوئی لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو اُن پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابلِ برداشت پابندیاں ہیں، اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنیکے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو مہاجر قرار دے دیا جاتا ہے تاکہ وہ پھر واپس نہ آسکیں۔ والدین اگر خود اپنے بچوں سے ملنے کے لیے جانا چاہتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے، اور ہجرت کرنے والے کیلیے یہ قانون بنایا جاچکا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس فی صدی جرمنی سے باہر لے جاسکتے ہیں، باقی سب کچھ ضبط۔

یہ اُن "قوموں" کا حال ہے جو "اوطان" سے بنی ہیں، اور ہمیں آج تک کسی ایک ملک کی مثال بھی ایسی نہیں ملی جہاں دستور اساسی کے بنیادی حقوق نے کسی اقلیت کو اپنے ہم وطنوں کی اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو۔ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک ہی قوم فرض کیا گیا ہے، اگرچہ جہاں اقلیت اور اکثریت میں مذہب یا تہذیب یا نسل یا رنگ یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے، وہاں جب اکثریت کو حاکمِ مطلق بننے کا موقع ملا تو اس نے اعلان حقوق کے باوجود یہی کوشش کی کہ یا تو اقلیت کو شودر بناکر رکھے، یا اس کے امتیازی وجود کو فنا کردے۔

ہماری قوم کے جو حضرات بنیادی حقوق کے اطمینان پر "جنگ آزادی" میں شریک ہو رہے ہیں ان میں سے ایک طبقہ (یعنی "قوم پرست" طبقہ) تو اپنے امتیازی وجود کو قربان کرنے پر بخوشی آمادہ ہے کہ دین جائے تو جائے، تن تو اچھی طرح پلے گا۔ اب باقی ماندہ حضرات ارشاد فرمائیں کہ وہ ان دونوں صورتوں

میں سے کس صورت کیلیے راضی ہیں ؟

مزید توضیح کیلیے ذرا اُن بنیادی حقوق کا تجزیہ بھی کر دیکھیے جو کراچی کے ریزولیوشن میں بیان کیے گئے ہیں :-

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے ، بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کیلیے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں ـــــ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے ۔ جمہوریت کے انگریزی نظریہ کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا ، اور اکثریت ہی کی حکومت اس کو نافذ کریگی ۔ لہذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض انکے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا ۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی ، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے ، بشرطیکہ وہ امنِ عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو ـــــ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے ۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی ، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہمکو دے رکھی ہے ، مگر اسکے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مُردہ ہو کر رہ گئی ۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں ، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً نا آشنا ، اور بالکل مختلف قسم کے نظریاتِ تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو ، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونیکا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائیگا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائیگا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں ۔ ہماری مسجدیں

توڑی نہیں جائینگی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائیگا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہوکر خود بخود آثار قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچینگے بلکہ مدرسے کے معلم نہایت شفقت و رحمت کیساتھ انکے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کرینگے جسکی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کرینگی۔ یہ آزادی محض ایک افیون ہے، تاکہ اسکی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لیکر جو مولوی صاحبان پشاور سے مدراس تک ماس کانٹیکٹ کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ پروانہ آپ کو تو اتنی آزادی ضرور دیتا ہے کہ رات دن قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں، آپکی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائیگی، نہ آپکی عبا ضبط کی جائیگی، نہ آپکی تسبیح چھینی جائیگی، نہ آپکی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی، مگر اس امر کی وہ کوئی ضمانت نہیں دیتا کہ آپکی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شنکر اور تیسری پشت میں کوئی دیویکا رانی برآمد نہ ہوگی۔ ایسے پروانۂ آزادی کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت مفعولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے۔ ہم استقلالِ وطن اسلیے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کرسکیں۔ اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی۔

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائیگی ـــــ حکومت کے روپے اور اسکی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مرجائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں۔ درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور انکی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائیگی، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے

کہ انکو زبردستی قتل نہ کیا جائیگا۔ باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں، تو حکومت پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یو پی کے وزیر تعلیم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے کہ انکا سوکھ سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے، تاکہ انکی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہمکو انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔ اس نے بھی ہم کو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورنیکلر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی۔ اگر یہی حالت اُس حکومت میں بھی ہو جسکو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اسلیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اُس طرح غذا دے سکیں جسطرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی قومی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ اسکے لیے ہمیں کسی جنگ آزادی کی ضرورت نہیں۔

یہ چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز انکے درمیان نہ ہوگا ——— یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنیکا قانون پاس کردے اور اسکی مخالفت کرنیوالی اقلیت کا اُسیطرح مذاق اُڑائے جسطرح ابھی چند روز ہوئے مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جا چکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کسی کام نہ آئیگی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندہ ملک پر اسکے مذہب یا جات پات، یا عقیدہ و مسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کیجائیگی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہو سکے ——— اس دفعہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظام حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبہ

عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنووں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے ——— یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی، جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رو سے گائے کی قربانی بند کی جاسکتی ہے، مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جن کے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں، جس کی پالیسی کی تشکیل، جس کے قوانین کی تشریع اور جس کے احکام کی تنفیذ میں ہم مفروضۂ قومیت، اور اصولِ جمہوریت اور پارٹی سسٹم کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کرسکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اسلیے حاصل کی جارہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اسکے بیٹے کو تخت نشین کرادیں، رہا ہمارا اپنا حال، تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابنِ فرعون کہتا ہے کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہیگی

(باقی)